دھوپ دیا
شکیل اعظمی

سورت جیسے شہر میں رہ کر تم اتنی اچھی شاعری کر لیتے ہو، وہ بھی اس عمر میں، کمال ہے۔

محمد علوی

شاعری جدید و قدیم نہیں ہوتی۔ اچھی یا بری ہوتی ہے۔ اچھی شاعری کو میں الفاظ کے شخصی استعمال اور فکر و خیال کے ذاتی احساسِ جمال کا کارِ محال سمجھتا ہوں۔ یہ مستعمل راستوں سے دور ہو کر اپنے بھٹکاؤ کی روشنی میں اپنی ڈگر کی تلاش کے مترادف ہے۔ شکیل اعظمی نئے شاعر ہیں لیکن انھوں نے دوسروں کی بینائی کے مقابلے میں اپنی بصارت پر اعتماد کیا ہے۔ ان کے الفاظ لغوی اکہرے پن سے آزاد ہو کر ان کے ترجمان بنے ہیں۔ ان کے یہاں اظہار و موضوع کی ہم رشتگی مستعمل پیرایوں سے الگ ہو کر ان کی شخصیت کی پہچان کراتی ہے۔ وہ اپنے رنگ ڈھنگ کے شاعر ہیں۔ انھوں نے تقلیدی سلامت روی کے بجائے انفرادی تجربات کے خطرات مول لیے ہیں جو ان کے روشن مستقبل کی علامتیں ہیں۔ میں ان کے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت پر ادبی دنیا میں ان کا استقبال کرتا ہوں۔

ندا فاضلی

شکیل اعظمی

دھوپ دریا

جواز پبلیکیشنز

"المامون" نعمانی چوک جامعہ روڈ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (بھارت)

دھوپ دریا

●

پیدائش ● ۱۹۷۱ - سہریا، اعظم گڈھ

آبائی وطن ● سیدھا سلطان پور، سرائے میر، اعظم گڈھ ۲۷۶۳۰۵ - یو-پی (بھارت)

رابطہ ● ۵/۱۸۰۸ ہندا اسٹورس، سید پورہ، مین روڈ، سورت ۳۹۵۰۰۳ (بھارت)

زیر اہتمام ● رضوان عثمانی، مرزا رضی بیگ، حاجی التمس بیگ

سرورق ● ساجد رشید

ترتیب ● نغم اعظمی، شکیل شاہ

کتابت و نظم ● گل آئی بی مالیگاؤں۔

پہلا ایڈیشن ● جنوری ۱۹۹۶ء پانچ سو

قیمت ● پچاس روپے 50.00

بیرونی ممالک سے ● پانچ امریکی ڈالر

طباعت ● اقصیٰ آفسیٹ پریس مالیگاؤں

ناشر ● جواز پبلیکیشنز

المامون نعمانی چوک، جامعہ روڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (بھارت)

تقسیم کار ●

● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

شاخیں ●

● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڈھ ۲۰۲۰۰۱

اس کتاب کی اشاعت میں گجرات اردو اکیڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

ماں کے نام

جس کی موت میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

کبھی سوتے میں ایسا لگتا ہے
سر کے نیچے تری ہتھیلی ہے

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

میرؔ

آگے آگے

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نثری نظمیں

غزلیں

ندی کو آب دیا ہے، تو کچھ بہاؤ بھی دے
مری غزل کو نیا پن بھی دے، رچاؤ بھی دے

چلا کے سرد ہوا مجھ کو منجمد بھی کر
پگھل کے پھیلنا چاہوں تو اک الاؤ بھی دے

کہ جس کے درد کا احساس تیرے جیسا ہو
کبھی کبھی مری فطرت کو ایسا گھاؤ بھی دے

عذابِ سیلِ مسلسل جو دے رہا ہے مجھے
تو سطحِ آب پہ چلنے کو ایک ناؤ بھی دے

مسافرت کے کئی مرحلے تمام ہوئے
کہ میری خانہ بدوشی کو اب پڑاؤ بھی دے

فریبِ زندگی کھا کر کبھی چالاکی نہیں آئی
کہ پانی میں کبھی رہ کے ہم کو تیراکی نہیں آئی

ابھی نامعتبر ہیں ہم، غزل تیری عبادت میں
وضو کرتے ہیں برسوں سے، مگر پاکی نہیں آئی

وگرنہ ہم سے دیوانوں کے سر محفوظ کیوں ہوتے
ابھی بستی سے ویرانے میں ادراکی نہیں آئی

زمانہ ڈھاک کے پتّوں سے باہر آگیا لیکن
ابھی تک جسمِ انسانی کو پوشاکی نہیں آئی

ابھی نا معتبر ہے سلسلہ ملنے ملانے کا
ابھی ہم دونوں کی چاہت میں بیباکی نہیں آئی

ابھی تو قتل ہونا ہے کہانی میں محبت کو
ابھی کردار کی آنکھوں میں نمناکی نہیں آئی

پرندے شام تک پیڑوں پہ واپس لوٹ آتے ہیں
ابھی تک ان کی پروازوں میں افلاکی نہیں آئی

تمہیں سماج کی پابندیوں سے نسبت ہے
پرائی آگ میں جلنا تمہارا کام نہیں

شاعری روح میں تحلیل نہیں ہو پاتی
ہم سے جذبات کی تشکیل نہیں ہو پاتی

ہم ملازم ہیں، مگر اتنی انا رکھتے ہیں
ہم سے ہر حکم کی تعمیل نہیں ہو پاتی

آسماں چھین لیا کرتا ہے سارے پانی
آنکھ بھرتی ہے مگر جھیل نہیں ہو پاتی

رات ہی کے کسی حصے میں بکھر جاتا ہوں
یاس امید میں تبدیل نہیں ہو پاتی

رات بھر کرب کے صحرا میں بھٹکتا ہوں مگر
صبح تک خواب کی تکمیل نہیں ہو پاتی

صدا لگاؤں بھی، تو گھر میں کون بولے گا
اب اتنی رات کو دروازہ کون کھولے گا

نہ جانے کب مَیں کھُلے پانیوں میں تیروں گا
نہ جانے کب وہ مرا بادبان کھولے گا

نہ جانے کب مرے اندر کا زہر کم ہو گا
نہ جانے کب وہ سماعت میں شہد گھولے گا

اگر یہ چاند بھی بادل کی نذر ہو جائے
تو صبح تک مری آنکھوں میں کون ڈولے گا

مَیں اک چراغ ہوں مٹی کا، ٹوٹ جاؤں گا
زمانہ مجھ کو اندھیرے میں جب ٹٹولے گا

ذرا سی دیر میں ٹوٹے گا شاخ سے پتّہ
پھر اس کے بعد ہواؤں کے ساتھ ہولے گا

ہمارے بعد غمِ روزگار سے ہٹ کر
یہی بہت ہے اگر کوئی آنکھ دھولے گا

کچھ اس طرح سے ملیں ہم، کہ بات رہ جائے
بچھڑ بھی جائیں تو ہاتھوں میں ہات رہ جائے

اب اس کے بعد کا موسم ہے سردیوں والا
ترے بدن کا کوئی لمس سات رہ جائے

مَیں سو رہا ہوں ترے خواب دیکھنے کے لیے
یہ آرزو ہے کہ آنکھوں میں رات رہ جائے

مَیں ڈوب جاؤں سمندر کی تیز لہروں میں
کنارے رکھی ہوئی کائنات رہ جائے

شکیلؔ! مجھ کو سمیٹے کوئی زمانے تک
بکھر کے چاروں طرف میری ذات رہ جائے

زندگی! ہم ترے احسان سے کب نکلیں گے
پھول سوکھے ہوئے گلدان سے کب نکلیں گے

در و دیوار مری روح کو کب چھوڑیں گے
میرے سائے مرے دالان سے کب نکلیں گے

یومِ آخر مری آنکھ میں کب آئے گا
تیرے اوصاف کُل انسان سے کب نکلیں گے

شاعری نے مرے لوگوں کو جدا مجھ سے کیا
یہ جراثیم مری جان سے کب نکلیں گے

ساحلی لوگ تحفظ کی دعا مانگتے ہیں
یہ سفینے ترے طوفان سے کب نکلیں گے

اجنبی ہاتھ مرے راہ نما کب ہوں گے
راستے منزلِ انجان سے کب نکلیں گے

جھوٹ اور سچ کو پرکھنا ہمیں کب آئے گا
ہم ترے کانچ کے پیمان سے کب نکلیں گے

جانے ہم شر کے حوالات سے کب چھوٹیں گے
راستے خیر کے جزدان سے کب نکلیں گے

درد میں شدتِ احساس نہیں تھی پہلے
زندگی رام کا بن باس نہیں تھی پہلے

ہم بھی سو جاتے تھے معصوم فرشتوں کی طرح
اور یہ رات بھی حساس نہیں تھی پہلے

ہم نے اس بار تجھے جسم سے ہٹ کر سوچا
شاعری روح کی عکاس نہیں تھی پہلے

تیری فرقت ہی اداسی کا سبب ہے اب کے
ورنہ قربت بھی ہمیں راس نہیں تھی پہلے

تیری آنکھوں نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو
اتنی شدت کی ہمیں پیاس نہیں تھی پہلے

راہ چلتے ہوئے ہم مڑ کے نہیں دیکھتے تھے
راستے میں تری بو باس نہیں تھی پہلے

جب دل کے ٹوٹنے کا سماں یاد آ گیا
پہروں لپٹ کے روئے ہیں سوکھے شجر سے ہم

اس طرح دھوپ میں دستار نہ ڈھونڈے کوئی
جیب خالی ہو تو بازار نہ ڈھونڈے کوئی

ہم سے دیوانوں کی تعداد بہت کم ہے یہاں
ہر گلی کوچے میں فنکار نہ ڈھونڈے کوئی

ہم تو آوارہ مسافر ہیں، پھرا کرتے ہیں
ہم کو اک شہر میں ہر بار نہ ڈھونڈے کوئی

حادثے شہر کا دستور بنے جاتے ہیں
اب یہاں سایۂ دیوار نہ ڈھونڈے کوئی

مجھ کو اجداد سے بس "مَیں" ہی ملا ورثے میں
مجھ سے ملنا ہو تو گھر بار نہ ڈھونڈے کوئی

مجھ کو اُس پار صدا دے کے سبھی لَوٹ آئے
مَیں یہیں ہوں، مگر اِس پار نہ ڈھونڈے کوئی

یہ پرندہ تو نگاہوں میں چھُپا بیٹھا ہے
لبِ انکار پہ اقرار نہ ڈھونڈے کوئی

ایسے طوفان میں تنکا بھی غنیمت ہے شکیلؔ
ناؤ مل جائے تو پتوار نہ ڈھونڈے کوئی

شہر جب اجڑا، تو گاؤں کا کھنڈر اچھا لگا
گھاس میں لپٹا ہوا مٹی کا گھر اچھا لگا

انگلیاں سب کی اسی جانب اٹھیں، لیکن ہمیں
تہمتوں کا تاج تھا جس پر، وہ سر اچھا لگا

اس کی باتوں سے کئی ذہنوں کے دروازے کھلے
اس کا لہجہ کھُردُرا تو تھا۔ مگر اچھا لگا

مجھ کو میری جان! طاؤسِ غزل کے پنکھ سے
میر کے آنگن میں جو ٹوٹا۔ وہ پر اچھا لگا

لوٹ آیا پھر سے بوڑھی راکھ کی آنکھوں کا نور
دل کی پگڈنڈی سے یادوں کا گُزر اچھا لگا

جاگ اٹھے گر ہم، تو شرمندہ نہ ہو پاگل ہوا
تیرا بلنا رات کے پچھلے پہر، اچھا لگا

بچپنا ساحل پہ تھا، دریا میں تھی کاغذ کی ناؤ
بہتے پانی پر اُمنگوں کا سفر اچھا لگا

شاعری معیوب ہے افسوس تیرے شہر میں
ورنہ دُنیا کو ہمارا یہ ہنر اچھا لگا

ذرا سے غم کے لیے جان سے گذر جانا
محبّتوں میں ضروری نہیں ہے مر جانا

کبھی لحاظ نہ رکھا کسی روایت کا
جو جی میں آیا اسے ہم نے معتبر جانا

وہ ریت ریت فضا میں تری صدا کا سراب
وہ بے ارادہ مرا راہ میں ٹھہر جانا

تمام رات بھٹکنا ترے تعاقب میں
ترے خیال کی سب سیڑھیاں اتر جانا

وہ من میں چور لیے پھرنا تیرے سائے کا
گلی کے موڑ پہ دیوار و در سے ڈر جانا

شکیل گاؤں کے سب لوگ سو گئے ہوں گے
اب اتنی رات کو اچھا نہیں ہے گھر جانا

ہم نے سوچا تھا بس میں جائیں گے
دھوپ رکشے کے پاس لے آئی

ترے سوال کا تنہا جواب مَیں ہی تھا
نگاہِ ناز! ترا انتخاب مَیں ہی تھا

مرے ہی خون سے ذہنوں کی برف پگھلی ہے
لہولہان پسِ انقلاب مَیں ہی تھا

یہ اور بات، کہ اب تو مجھے نہ پہچانے
گذشتہ شب تری آنکھوں کا خواب مَیں ہی تھا

ترے سوا کبھی کئی اور موڑ تھے، لیکن
ترے فسانے کا لُبِ لباب مَیں ہی تھا

مرے وجود سے روشن تھیں حسرتیں تیری
ترے فلک کا کبھی آفتاب مَیں ہی تھا

یہ میری خانہ بدوشی، مرا نصیب نہ تھی
خود اپنی ذات کی خاطر عذاب مَیں ہی تھا

سبھی کے جسم پہ اچھائی کی مہر تھی شکیلؔ
اس انجمن میں اکیلا خراب مَیں ہی تھا

ترے مزاج سے کیا انحراف مَیں نے کیا
یہیں سے راہ بدلنے کی رسم چل نکلی

تمام رنگ سفیدی پہ تھا سیاہی کا
کوئی ثبوت نہ تھا میری بے گناہی کا

بجز سحر کے کوئی دوسرا چراغ نہ تھا
یقین کرنا پڑا رات کی گواہی کا

بڑا گمان ہے خانہ بدوش لوگوں کو
مکان والوں کا دعوہ ہے سر پناہی کا

چراغِ نام و نسب بجھ گیا اندھیرے میں
غرور ٹوٹ گیا ساری کج کلاہی کا

جہاں سے تم نے پکارا تھا ہم کو پہلے پہل
وہیں کہیں سے چلا سلسلہ تباہی کا

اک ایسا موڑ بھی پڑتا ہے اس گلی میں شکیلؔ
گذر ہوا نہ ابھی تک جہاں سے راہی کا

اب اس سے ملنے کی امید کیا، گماں بھی نہیں
زمیں گئی تو گئی، سر پہ آسماں بھی نہیں

بجھا بجھا سا ہے دل کا الاؤ برسوں سے
کسی کی یاد کا آنکھوں میں اب دھواں بھی نہیں

نئی صدی کے سفر میں بھی ہم اکیلے ہیں
ہوا کے دوش پہ خوشبو کا کارواں بھی نہیں

تمہیں بتاؤ، یہاں کس طرح جئیں ہم لوگ
تمہارے شہر میں غزلوں کی اک دکاں بھی نہیں

گھروں میں سہم کے بیٹھے ہوئے ہیں سب بچے
سمندروں پہ کہیں ریت کا مکاں بھی نہیں

اس احتیاط سے آنکھوں میں کون آیا تھا
ثبوت کے لیے پلکوں پہ اک نشاں بھی نہیں

اک ایسے راز کی مانند جی رہا ہوں شکیلؔ
کہ جس کا میرے سوا کوئی رازداں بھی نہیں

راز میں رکھ، تری رسوائی کا قصہ مَیں ہوں
مجھ کو پہچان! ترا دوسرا چہرہ مَیں ہوں

دفن ہیں تیرے کئی راز مرے سینے میں
جو ترے گھر سے گذرتا ہے وہ رستہ مَیں ہوں

مدّتوں بعد بھی جاری ہے عذابوں کا سفر
قطرہ قطرہ تری آنکھوں سے ٹپکتا مَیں ہوں

آ، ذرا بیٹھ مرے پاس کبھی کچھ پل کے لیے
میرے ہمدم تری دیوار کا سایہ مَیں ہوں

اب بھی زندہ ہوں تری روح میں غم کی صورت
کون کہتا ہے، کہ ٹوٹا ہوا رشتہ مَیں ہوں

مجھ کو پوجے گی، تہِ خاک جو دنیا ہے شکیلؔ
کل جو ٹوٹا تھا فلک سے وہ ستارہ مَیں ہوں

قلب وجاں سے روز لڑتا کون ہے
مجھ میں بنتا اور بگڑتا کون ہے

خواہشوں کا زور تھم جانے کے بعد
دل کا دریا بے صدا ہو جائے گا

سفید پنچھی

(اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کے لیے ایک دعا)

خدائے برتر!
فصیلِ جاں کے سبھی پلستر اکھڑ چکے ہیں
تمام اینٹیں دکھائی دینے لگی ہیں اب تو
کہیں کہیں سے تمام گارے بھی بہہ چکے ہیں
وہ اس لیے کہ کئی برس سے
نہ دھوپ نکلی نہ چاند نکلا

نہ کوئی تارہ ہی جھلملایا
یہاں تلک کہ ہوا کے ہاتھوں میں
اک دیا، جو بجھا بجھا تھا
کہ جس میں پنہاں تھی لَو امیدوں کی
گر کے دستِ ہوا سے
سیلِ رواں کی لہروں میں کھو چکا ہے
سفید پنچھی بھی اڑ چکے ہیں
یہی سبب ہے
فصیلِ جاں کی تمام سمتیں
کئی برس سے ہیں تیرگی میں
خدائے برتر!
بڑوں کو کہتے سنا ہے مَیں نے
کہ تُو اندھیرے اُجال دیتا ہے
تُو عذابوں کو ٹال دیتا ہے
گر یہ سچ ہے
تو ایک ایسی سحر عطا کر
کہ جس کے دل میں سفید بادل کا غم نہیں ہو
کہ جس کی آنکھوں میں کالے بادل کا ڈر نہیں ہو
کہ جس کے سر پہ پھیلا ہوا اک گگن ہو نیلا
جہاں سے سورج کی تیز کرنیں زمیں پہ اتریں

تمام سیلِ رواں کو پی لیں
تمام گیلی زمیں سکھا دیں
فصیلِ جاں سے سفید پنچھی جو اڑ گئے تھے
چراغ جلتے ہی لوٹ آئیں

••

فرار

مَیں کہ بچپن میں ایک دن گھر سے
ایسا بھاگا کہ بھاگتا ہی رہا
شہر در شہر بے گھری کا عذاب
آسماں میرے نام لکھتا رہا
میری خانہ بدوشیاں مجھ سے
کہہ رہی ہیں کہ ٹھہر جاؤں کہیں
اور کچھ تھک چکا ہوں اب مَیں بھی
چاہتا ہوں کہ ایک شب کے لیے
ٹھہر کر راستے میں دم لے لوں
اس سے پہلے کہ خیمہ نصب کروں
چند سائے مرے تعاقب میں
دور ہی سے دکھائی دیتے ہیں

اور پھر بھاری بھاری قدموں کی
چاپ کانوں میں پڑنے لگتی ہے
فاصلہ بھی سمٹنے لگتا ہے
اور مَیں پھر سے پاگلوں کی طرح
ایک جانب کو دوڑ پڑتا ہوں
اور پھر سب ڈراؤنے سائے
دھند کے پیچھے ڈوب جاتے ہیں
مَیں، کہ اس بار بھی صدا کی طرح
ان کے چنگل سے بچ نکلتا ہوں
بچ نکلنا بھی اک عذاب سا ہے
سلسلہ ختم کیوں نہیں ہوتا
ایک جائے امان کی خاطر!
کب تلک بھاگتا رہوں گا مَیں

لہو لمس

کسی معصوم بچی
یا ضعیف العمر عورت کا سراپا
جب مری آنکھوں میں آتا ہے
تو جانے کیوں مری نظریں
اسے انکار کرتی ہیں
نہ جانے کیوں مجھے اترا ہوا دریا
بہت سیراب کرتا ہے

یہی ٹھہرا ہوا پانی
مجھے سیلِ رواں معلوم ہوتا ہے
نہ جانے کون سی حس ہے
کہ جس کے جاگنے سے
پھول بن جاتی ہیں یہ کلیاں
کھنڈر تبدیل ہو جاتے ہیں محلوں میں
تمہیں معلوم ہے
وہ کون سا جذبہ ہے
جو چہروں پہ اَنْدیکھی جوانی ثبت کرتا ہے

پانی سے نکلتا ہوا جزیرہ

مجھے مرے
تجھے بچھڑے تو اک زمانہ ہوا
تو پھر یہ کیا ہے جو دنیا اجاڑ لگتی ہے
کئی دنوں سے کوئی فلم بھی نہیں دیکھی
کسی کے ساتھ منانے گیا نہ پکنک ہی
شراب میں بھی وہ پہلا سا ذائقہ نہ رہا
اکیلے پن کا پھر احساس جاگ اٹھا ہے
اگر یہ تیری کمی ہے تو مجھ کو زندہ جان!
یہیں کہیں سے کسی دن میں تجھ کو چھو لوں گا

ایک نظم (خلیل الرحمٰن اعظمی کے لیے)

تیسری آنکھ، دوسرا چہرہ
ایسے لپٹے ہیں ذات سے میری
جس طرح سبز پیڑ کو دیمک
اندر اندر ہی کھوکھلا کر دے
مَیں بھی اک سبز پیڑ کے مانند
کھوکھلا ہو چکا ہوں اندر سے
دیکھنے میں ہرا بھرا سا ہوں
یہ دکھاوا ابھی خشک ہو جائے
اور مَیں اپنے ہاتھوں اپنا وجود
اپنی ہی آگ میں جلا ڈالوں
تیسری آنکھ بند ہو جائے
دوسرا چہرہ راکھ ہو جائے
زندگی کو شکست دے جاؤں
دیمکوں سے نجات پا جاؤں

بمبئی کی تین نظمیں

وقت

کس کو اتنی فرصت ہے جو تمہیں جگائے
چائے پلائے
بات کرے
باہر لے جائے
لوکل ٹرینیں لمحہ بھر ہی رکتی ہیں
سورج بھی بیڑی سلگا کر چل دیتا ہے

زندگی

زندہ رہنے کی خواہش میں
دن کا بوجھ اُٹھانے والے
راتوں کو جب تھک جاتے ہیں
دارو سے روٹی کھاتے ہیں
اور سڑک پر سو جاتے ہیں
سورج جب ملنے آتا ہے
جیبیں سب خالی ہوتی ہیں

مشورہ

اچھے اور بُرے کی جب تک
لوگوں میں پہچان آئے گی
کاغذ کے پیڑوں کو مٹی کھا جائے گی
اور سیاہی
آسمان کی آنکھوں میں جم جائے گی
بجلی کے کھمبوں پر بلب جلے بھی ہوں تو کیا حاصل
لفظوں سے آنکھوں کے رشتے ٹوٹ چکے

پیارے شاعر!
لٹریچر کے اندھے غار سے باہر آ
موسیقی کو سونپ دے اپنے سارے دُکھ
ہونٹوں اور کانوں کی مٹی گیلی ہے

بکھراؤ

گھر کا رستہ دُور بہت ہے ہوٹل سے
لیکن وہ کھانے
جو مَیں نے بچپن میں
اپنی ماں کے ہاتھوں کچھ دن کھائے تھے
بھوکا جب سوتا ہوں تو یاد آتے ہیں

(۲)

بستر دن بھر یونہی بکھرا رہتا ہے
رات کو کافی دیر سے سونے آتا ہوں
سورج جب آنکھوں میں آ کر گرتا ہے
ڈول میں بھر کر دور سے پانی لاتا ہوں
ٹوتھ پیسٹ اور برش کہیں پر ہوتے ہیں
صابن دانی طاق پہ رکھی ملتی ہے
لیکن صابن اکثر غائب ہوتا ہے
ہاتھ روم بھی چلتا پھرتا رہتا ہے
چھالوں نے پیروں سے کل بھی پوچھا تھا
یہ سب چیزیں ایک جگہ کب آئیں گی

ہمزاد

بہت پہلے جو نفرت جاگ اٹھی تھی
لہو میں اک سفیدی آ گئی تھی
زمین و دل کا بٹوارہ ہوا تھا
مرے آنگن میں اک دیوار اٹھی تھی
وہی دیوار اک مدت کے بعد
شکستہ ہوتے ہوتے گر گئی ہے
پرانے زخم تازہ ہو گئے ہیں
کوئی مجھ کو صدائیں دے رہا ہے
مرے اندر خموشی چیخ اٹھی ہے
مرا ہمزاد زندہ ہو گیا ہے

موسموں کے عذاب سہتا ہے
پیڑ سرسبز پھر بھی رہتا ہے

اس کا لہجہ ہے کھُردرا لیکن
بات کتنے پتے کی کہتا ہے

کس میں بھنورے کا وصف در آیا
کون خوشبو کے گھر میں رہتا ہے

شہر کی اونچی نیچی سڑکوں پر
آدمی کا وجود بہتا ہے

جب سے آیا ہے گاؤں سے لڑکا
اپنے کمرے میں بند رہتا ہے

کس کا سایہ ہے میرے کمرے میں
کون رہتا ہے میرے کمرے میں

در و دیوار بھی نہیں کھلتے
کون آتا ہے میرے کمرے میں

دھول اڑتی ہے اک زمانے سے
کیسا صحرا ہے میرے کمرے میں

رات بھر سسکیاں سی سنتا ہوں
کون روتا ہے میرے کمرے میں

ایک بے نور سا دیا شب بھر
روز جلتا ہے میرے کمرے میں

ایک سایہ سا آدھی رات گئے
مجھ سے ملتا ہے میرے کمرے میں

رات کھڑکی سے لگ کے سوئی ہے
چاند ٹھہرا ہے میرے کمرے میں

ایک گلدان رکھ کے دیکھتا ہوں
کیسا لگتا ہے میرے کمرے میں

میرے سب راز جانتا ہے شکیلؔ
اک دریچہ ہے میرے کمرے میں

ایسے جنگل میں وہ اکیلی ہے
کوئی لڑکی ہے . یا پہیلی ہے

آگے پریوں کا دیس ہو شاید
دور تک راہ میں چمیلی ہے

اس میں صدیوں سے بھوت رہتے ہیں
گاؤں کے پاس جو حویلی ہے

مجھ کو مکھیا کا قتل کرنا ہے
اور گروی مری ہتھیلی ہے

کبھی سوتے میں ایسا لگتا ہے
سر کے نیچے تری ہتھیلی ہے

آؤ، اب ہم بھی ڈوب جاتے ہیں
یار لوگوں نے تاؤ کھے لی ہے

ایک دن تیرے ساتھ دیکھا تھا
کیا غزل بھی تری سہیلی ہے

اس کا لہجہ تمہارے جیسا ہے
یہ غزل ہم نے چاند سے لی ہے

رنگ کے تجربے میں ہم نے شکیلؔ
ایک تتلی کی جان لے لی ہے

میری آنکھوں میں کرچیاں رکھ دے
ریت کے گھر میں آندھیاں رکھ دے

میرے خوابوں کو توڑ کر کوئی
میری آنکھوں میں کرچیاں رکھ دے

یا کوئی خواب دے نگاہوں کو
یا دریچے پہ انگلیاں رکھ دے

ایک جھونکا ہوا کا یوں آئے
کھول کر ساری کھڑکیاں رکھ دے

آنے والے مسافروں کے لیے
راستے میں نشانیاں رکھ دے

میرے ہونٹوں پہ خامشی ہے بہت
ان گلابوں پہ تتلیاں رکھ دے

اگلا موسم ثبوت مانگے گا
ان درختوں کی پتّیاں رکھ دے

اب جوانی حساب مانگتی ھے
میرے چہرے پہ جھُرّیاں رکھ دے

مری ہی ذات میں ہنگامۂ سحر بھی تھا
شبِ خموش کا مَیں آخری پہر بھی تھا

کسی کا بڑھتا ہوا ہاتھ سرد موسم میں
پکڑ لیا تھا، مگر چھوٹنے کا ڈر بھی تھا

مَیں جس کے جسم کا سایہ بھی چھو نہ سکتا تھا
یہ المیہ ہے، وہی میرا ہمسفر بھی تھا

مَیں ایسے شخص کی پرچھائیوں میں زندہ ہوں
جو تھک چکا بھی تھا، آمادۂ سفر بھی تھا

جسے مَیں گاؤں کے کنویں میں پھینک آیا ہوں
اسی سماج کے نیزے پہ میرا سر بھی تھا

جو دن میں سوتا تھا، راتوں کو جاگتا تھا شکیل
پڑوس والوں میں اک شخص بے ہنر بھی تھا

مَیں جہاں ہوں وہاں سے اردو کا
ایک اخبار تک نہیں چھپتا

تجھ کو سوچوں، تو ترے جسم کی خوشبو آئے
میری غزلوں میں علامت کی طرح تو آئے

مَیں تجھے چھیڑ کے خاموش رہوں، سب بولیں
باتوں باتوں میں کوئی ایسا بھی پہلو آئے

قرض ہے مجھ پہ بہت رات کی تنہائی کا
میرے کمرے میں کوئی چاند، نہ جگنو آئے

لگ کے سوئی ہے کوئی رات مرے سینے سے
صبح ہوجائے، کہ جذبات پہ قابو آئے

چاہتا ہوں، کہ مری پیاس کا ماتم یوں ہو
پھر نہ اس دشت میں مجھ سا کوئی آہو آئے

اس کا پیکر کئی قسطوں میں چھپے ناول سا
کبھی چہرہ، کبھی آنکھیں، کبھی گیسو آئے

پھر مجھے وزن کیا جائے شہادت کے لیے
پھر عدالت میں کوئی لے کے ترازو آئے

اب کے موسم میں یہ دیوار بھی گر جائے شکیل
اس طرح جسم کی بنیاد میں آنسو آئے

شکل چھپ جائے تو آواز پہ رکھا جائے
اک نشانہ اسی انداز پہ رکھا جائے

دل کی بستی سے اُجالے کا گذر ہو کہ نہ ہو
اک دیا چہرۂ غماز پہ رکھا جائے

بازیاں ہار رہے ہیں تو چلو یونہی سہی
آخری داؤ نئے باز پہ رکھا جائے

ہم کو منظور ہے الزام روایت شکنی
اک نیا گیت نئے ساز پہ رکھا جائے

ہم سے تحریکِ محبت تو نہیں رک سکتی
کیوں نہ الزام ہی آغاز پہ رکھا جائے

مَیں غزل کے لہجے میں اس طرح سنائی دوں
بھیڑ میں بھی نکلوں تو منفرد دکھائی دوں

مَیں کہ لمس جسموں کا، مَیں کہ کرب روحوں کا
دُور تک نظر آؤں، دیر تک سُنائی دوں

کیوں نہ اس روایت کو توڑ کر گزر جاؤں
جسم کی عمارت سے روح کو رہائی دوں

اک ذرا غزل کہہ کر اس قدر خوشی پاؤں
تیرے نام خط لکھوں اور تجھے بدھائی دوں

کتنا ہی اندھیرا ہو زندگی کے چہرے پر
تو مجھے نظر آئے، مَیں تجھے سُجھائی دوں

چڑھا ہوا ہے جو دریا، اُترنے والا ہے
اب اس کہانی کا کردار مرنے والا ہے

یہ آگہی ہے کسی حادثے کے آمد کی
بدن کا سارا اثاثہ بکھرنے والا ہے

ذرا سی دیر میں زنجیر ٹوٹ جائے گی
جنون اپنی حدوں سے گذرنے والا ہے

سنا ہے شہر میں آیا ہے جادوگر کوئی
تمام شہر کو تصویر کرنے والا ہے

تمام شہر بنایا گیا ہے آئینہ
یہ آج کس کا سراپا سنورنے والا ہے

شکیلؔ ہم سے کسی کو شکایتیں ہیں بہت
چلو کوئی تو ہمیں پیار کرنے والا ہے

ایک ٹھہرے ہوئے دریا کو روانی دینا
سب کو آتا نہیں لفظوں کو معانی دینا

ہوا نہ ختم سروں سے عذاب بارش کا
وہی ہے شہر، وہی مسئلہ رہائش کا

زمیں کی کوکھ اجڑ جائے اب کے بارش میں
پتہ چلے نہ ہمیں آسماں کی سازش کا

یہاں کے لوگ کبھی ہوتے تھے دیوتا جیسے
بڑا رواج تھا اس گاؤں میں پرستش کا

پہن رکھے تھے سبھی نے ضرورتوں کے لباس
کسی کو شوق نہ تھا جسم کی نمائش کا

یہ اور بات، کہ ہم اب بھی روز ملتے ہیں
طلسم ٹوٹ چکا ورنہ تیری خواہش کا

کہ وہ ملے، تو سلام و دعا نہ ہو اس سے
لحاظ اتنا بھی رکھا نہ جائے بندش کا

شکیلؔ! پوچھنے والوں کو کیا بتائیں
کوئی سبب ہی نہیں تھا ہماری رنجش کا

میرے بچے بھی پڑوسی کا ہنر لے لیتے
ان کو روکا نہیں جاتا تو اثر لے لیتے

وہ تو اچھا ہوا میں نے انھیں موقع نہ دیا
ورنہ یہ لوگ مرا دستِ ہنر لے لیتے

تم نہیں جانتے ان دل کے طلبگاروں کو
اور کچھ دیر جو رک جاتے تو سر لے لیتے

جس میں انسان محبت کا پیمبر ہوتا
ایسی بستی کوئی مل جاتی تو گھر لے لیتے

کوئی دیوار نہ گرتی، نہ تنازعہ بڑھتا
تم جو دروازے کو تھوڑا سا اُدھر لے لیتے

پھر یہ برفیلی ہوائیں بھلا کس گھر جاتیں
ہم بھی بازار سے کچھ دھوپ اگر لے لیتے

تیرے آنسو تجھے لوٹا دیے مَیں نے، ورنہ
میری آنکھوں میں جمی گردِ سفر لے لیتے

کیا ضروری تھا، کہ ہر بار وہی آتا شکیل
کوچ کے وقت تمہیں جا کے خبر لے لیتے

کسی کا ہاتھ لیے اک قطب نما نکلا
قدم جو گھر سے نکالا تو راستہ نکلا

جلایا دھوپ میں خود کو، تو ایک سایہ سا
ہمارے جسم کی دیوار سے لگا نکلا

تمام عمر بھٹکتا رہا تری خاطر
ترا وجود ہی ہستی کا مدعا نکلا

تمہاری آنکھوں میں صدیوں کی پیاس ڈوب گئی
ہماری روح سے احساس کربلا نکلا

گریز کرنے لگا ہے ترے خیال سے بھی
ہمارا دل بھی تری طرح بے وفا نکلا

مرا ہی نام کبھی میرؔ تھا غزل والو!
نئے سفر میں بھی میرا ہی نقشِ پا نکلا

چراغ گھر میں جلا چھوڑ کر گئے تھے شکیلؔ
سفر سے لَوٹے تو سب کچھ بُجھا بُجھا نکلا

کچھ ہم بھی ہیں حساس طبیعت چلو مانا
کچھ چوٹ بھی کرتے ہیں تری بات کے پتھر

کبھی کبھی تری آواز پر رکوں بھی نہیں
کہ تو بلائے مجھے، اور مَیں سنوں بھی نہیں

اس انتظار میں ضد کا بھی ایک پہلو ہے
کواڑ کھول دوں، اور راستہ تکوں بھی نہیں

تمام شہر سے، مجھ کو تیرے ہونٹوں سے
ترے سوا مَیں کسی اور پہ کھُلوں بھی نہیں

وہ دور ہو، تو لگے اس سے کوئی رشتہ ہے
قریب آئے تو مَیں اس کا کچھ لگوں بھی نہیں

لکھے گا کون ادھوری تلاش کا نوحہ
تری طلب کا مرے سر میں اب جنوں بھی نہیں

نہ جانے ٹوٹ کے گر جائے کب سروں پہ شکیلؔ
کہ آسماں کی عمارت میں اک ستوں بھی نہیں

ذرا بھی جان کا خطرہ اٹھا نہیں سکتے
یہ لوگ تیر کے اس پار جا نہیں سکتے

علامتوں کے حوالے سے خود کو پہچانو
ہم ان لکیروں میں چہرہ بنا نہیں سکتے

قصوروار بھی ٹھہرے اگر، تو ہم سے غلام
امانِ جاں کے لیے سر جھکا نہیں سکتے

خوشی میں لپٹی ہوئی چند ساعتوں کے عوض
تمام عمر ترا غم اٹھا نہیں سکتے

بہت عزیز ہیں مانا کہ تیرے غم، لیکن
ہم اس سفر میں ترے ساتھ آ نہیں سکتے

کوئی اٹھائے بھی ہم کو تو کس طرف لے جائے
ہم اپنے گھر کا پتہ بھی بتا نہیں سکتے

نظر بھی آئے اگر وہ، تو زندگی میں شکیلؔ
وہ شور ہے، کہ صدا بھی لگا نہیں سکتے

تتلیاں پکڑنے کا مشغلہ لڑکپن کا
رنگ اب بھی گہرا ہے تیرے میرے بچپن کا

رات کے اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چلتا
جانے کون چلتا ہے شور دل کی دھڑکن کا

رات کی خموشی میں مجھ سے بات کرتا ہے
میرے دکھ کا ساتھی ہے پھول تیرے آنگن کا

یار! اس جزیرے پر جانے کون رہتا ہے
دن ڈھلے جو چھیڑے ہے راگ میرے جیون کا

اس طرف کا منظر بھی منتظر تھا آنکھوں کا
ٹوٹنا ضروری تھا زندگی کے درپن کا

سمندروں سے ملے گا مجھے سکوں کب تک
مَیں اپنی پیاس کو اس ریت پر لکھوں کب تک

جھلستی دھوپ میں اک سایہ دار ساتھی ہو
مَیں اپنے جسم کی پرچھائیاں تکوں کب تک

مرے خدا! مرے کمرے کو ایک کھڑکی دے
مَیں اپنے آپ کو تابوت میں رکھوں کب تک

ہمارے بعد بھی ہم جیسے لوگ آئیں گے
ہدف بنے گا خدا جانے یہ جنوں کب تک

وہ رُت بھی آئے، کہ جذبات سرد پڑ جائیں
بدن میں شور مچائے گا گرم خوں کب تک

کبھی کبھار درِ دل پہ آ کے دستک دے
تری نگاہ کی خاموشیاں سنوں کب تک

اب اس کتاب کو اندر سے دیکھنے دے مجھے
سرِ ورق پہ لکھے شعر کو پڑھوں کب تک

سنبھال لیتے ذرا سا، تو سخت ہو جاتا
پھر کچھ ہی دنوں میں یہ پودا درخت ہو جاتا

لبوں سے چھوٹ کے دیوارِ دل سے جا لگتا
مری زبان کا پتھر کرخت ہو جاتا

مری اڑان کسی شے کے کام آ جاتی
مرا خیال پرندوں کا بخت ہو جاتا

جو تو نہ تھا، تو تری یاد کیوں نہیں آئی
نئے سفر کے لیے کچھ تو رخت ہو جاتا

بس ایک لفظ نے جملے کی لاج رکھ لی شکیلؔ
وگرنہ بات کا انداز سخت ہو جاتا

ہم اپنے عہد سے کچھ اس لیے بھی پیچھے تھے
ہمارے سر پہ پرانی انا کے ملبے تھے

ہم ایسے وقت میں آواز بھی کسے دیتے
نظر کے سامنے کچھ ڈوبتے جزیرے تھے

وہ بجھ گیا تو چلا اس کی اہمیت کا پتہ
کہ اس کی آگ سے کتنے چراغ جلتے تھے

مجھے اتار کے خود کو بچا لیا اس نے
مَیں وہ لباس ہوں جس پر لہو کے دھبّے تھے

ترے قریب سے گذرے، تو یوں لگا ہم کو
بہت دنوں سے تری بازگشت سنتے تھے

ہمارے حال پہ روئی تھی بند کھڑکی بھی
ہوا کے ہاتھ کسی نے پیام بھیجے تھے

رستے کی دھول چاٹ گئی جسم کا لہو
کانٹوں کا زہر پاؤں کے چھالوں میں بٹ گیا

ایک دیوار ہو . جو ٹوٹی ہو
کوئی صورت تو میرے جیسی ہو

ایک تحریر میری انگلی کی
پانیوں کے بدن پہ لکھی ہو

اس کے پیکر پہ ایسا چہرہ ہے
جیسے کوئی کتاب رکھی ہو

ایک تصویر ایسی مل جائے
جو تری طرح بات کرتی ہو

گھر میں آنگن ہو. اور آنگن میں
چند کلیاں ہوں، ایک تتلی ہو

مَیں اندھیروں میں ڈوب جاؤں کہیں
گھر کی چوکھٹ پہ آنکھ روتی ہو

مَیں، کہ سو جاؤں اس کے پہلو میں
میرے بالوں میں اس کی انگلی ہو

وہ، کہ باہنوں میں بھینچ لے مجھ کو
میرا سارا وجود زخمی ہو

چپکے چپکے کلام کرتا ہے
چاند کس کو سلام کرتا ہے

کون دیوانہ ہے ہماری طرح
کون نیندیں حرام کرتا ہے

کس کو آوارگی کی فرصت ہے
کون جنگل میں شام کرتا ہے

کون رکھتا ہے پھول کمرے میں
کون یہ اہتمام کرتا ہے

تیرا شاعر بھی کتنا پاگل ہے
دل کی باتوں کو عام کرتا ہے

پھر شکیلؔ آج اپنی سب غزلیں
تیرے ہونٹوں کے نام کرتا ہے

شکیلؔ مَیں کسی آوارہ روح کی مانند
عجب لگاؤ رہا ہے حویلیوں سے مجھے

ہم، کہ مقروضِ جسم وجاں بھی ہیں
اور ترے زیرِ آسماں بھی ہیں

سیر کرتے ہیں آسمانوں کی
اور ہم لوگ بے مکاں بھی ہیں

چاہتے ہیں، کہ منفرد ہو جائیں
اور پابندِ کارواں بھی ہیں

قربتوں کے بدن سے لپٹے ہوئے
کچھ تقاضائے درمیاں بھی ہیں

لمس جسموں کے تتلیوں کی طرح
موسمِ گل کے رازداں بھی ہیں

بوڑھے مالی کی سُرخ آنکھوں میں
پھولدانوں کی داستاں بھی ہیں

میز پر پھولدان رکھا ہے
اور کمرے میں تتلیاں بھی ہیں

شکل دے کوئی سبز موسم کی
اب ضرورت بہت ہے مرہم کی

پھول کا سر کھلا نہ چھوڑا جائے
دھوپ دشمن بہت ہے شبنم کی

ہم کو محفوظ کر لیا جائے
ہم امانت ہیں اگلے موسم کی

کون آیا تھا اِن مزاروں پر
لَو چراغوں کی کس نے مدّھم کی

کچھ مقدر تھا اس کا نہ ملنا
اور کچھ ہم نے جستجو کم کی

تم کو سوچا تو ہونٹ کھل اٹھے
اور تم نے ہی آنکھ بھی نم کی

آؤ، غم بھولنے کی رُت آئی
بوتلیں کھول دی گئیں رم کی

لوگ تیزی سے مر رہے ہیں شکیلؔ
رسم اٹھنے لگی ہے ماتم کی

دھوپ دریا

مجھے قطعی علم نہ تھا
کہ ہمارا اگلا سفر
دھوپ دریا کا سفر ہے
مجھے تھوڑی سی مہلت دو
تاکہ مَیں بھی
تم لوگوں کی طرح
اپنا بدن
اپنے کمرے میں رکھ آؤں

سچ

مَیں جانتا ہوں
تم میری بات پر یقین نہیں کرو گے
مگر یہ طے ہے
کہ تم جس "سچ" کو
مٹانے پر تُلے ہوئے ہو
تمہاری آنے والی نسلیں
اس کی علمبردار ہوں گی

انکشاف

مجھے میرے ہمزاد نے
کل رات
بڑے ہی رازدارانہ انداز میں بتایا
کہ میری عمر کافی طویل ہے
اور جب تک مَیں زندہ رہوں گا
احساسات کے زہریلے سانپ
میرے وجود کو ڈستے رہیں گے
اس انکشاف نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے

اور میں اوورٹیک کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن
اس سے پہلے، کہ میں کسی جانب کو بھاگتا
کسی نے کہا۔ ٹھہرو
خودکشی حرام ہے
مجھے یاد آیا کہ میں صرف شاعر ہی نہیں
ایک انسان بھی ہوں
میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا
احساسات کے زہریلے سانپ
پھن پھیلائے ہوا میں لہرا رہے تھے
میرے ہمزاد کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا
اس کے دونوں رخسار پھولے ہوئے تھے
اور اس کی بین سے نکلنے والی دھنیں
ان سانپوں کے زہر سے کہیں زیادہ تلخ تھیں

گواہی

مجھے وٹنس بکس میں طلب کیا جا چکا تھا
مقتول کے ورثا
اور دوسرے لوگوں کی نظریں
میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں
اس لیے کہ مَیں اس مقدمے کا
تنہا چشم دید گواہ تھا
میری گواہی قاتل کو سزائے موت
یا عمر قید کی سزا دلا سکتی تھی۔ لیکن
اس سے پہلے کہ میرے ہونٹ ہلتے
جج نے مجھے گھورتے ہوئے کہا
تم گواہی نہیں دے سکتے
تمہاری شہادت کی انگلی کٹی ہوئی ہے

سورت کا "چوٹا بازار"

یہاں ہر شام
گلابوں کے شاداب پودے
گملوں سے نکل کر
پاؤں پاؤں آتے ہیں
اپنی اپنی پسند کے پھول خریدتے ہیں
اور خالی ٹہنیوں پر ٹانک لیتے ہیں
پھولوں کے اس چلتے پھرتے باغیچے میں
مجھ جیسے کچھ پاگل پنچھی
خوشبوؤں کے دو پل جی کر
رات گئے تک مرتے ہیں

غزلوں سے ذکرِ عارض و لب ختم ہوگیا
اک خواب تھا جو آخرِ شب ختم ہوگیا

اک چاند تھا، جو سو گیا بادل کو اوڑھ کر
کنویں میں جھانکنے کا سبب ختم ہوگیا

بارش کی تیز دھار ہمیں کاٹنے لگی
گرتا ہوا مکان بھی جب ختم ہوگیا

جس کی شگفتگی پہ بڑا ناز تھا ہمیں
اس خواب کا خمار بھی اب ختم ہوگیا

بکھرے ہوئے پڑے ہیں امنگوں کے سارے تاش
کل رات زندگی کا کلب ۔ ختم ہو گیا

پھر یوں ہوا، کہ رات ہمیں نیند آ گئی
جادو ترے فریب کا سب ختم ہو گیا

مجھ سے ہی محترم تھا زمانے میں وہ شکیلؔ
مَیں مر گیا تو اُس کا لقب ختم ہو گیا

ہر ایک سینۂ حساس میں دھڑکتا ہوں
بہت دنوں سے صلیبِ غزل پہ لٹکا ہوں

شبِ فراق! تری آنکھ کے ستاروں سے
مَیں روز کتنے خیالوں کی مانگ بھرتا ہوں

بچا لے مجھ کو شبِ ہجر کی تباہی سے
مَیں تیرے جسم کا سب سے عزیز حصّہ ہوں

ابھی بھی وقت ہے دامن میں جذب کر لے مجھے
ذرا سی دیر میں پلکوں سے گرنے والا ہوں

سُنیں گے لوگ مرا کرب اگلے وقتوں میں
مَیں آنے والے دنوں کے کھنڈر کا قصّہ ہوں

ذرا سی پاؤں کی آہٹ بھی ہو تو جاگ اٹھوں
مَیں اپنی نیند کو چوکھٹ پہ رکھ کے سویا ہوں

جو مجھ کو دن کے اجالے میں ڈھونڈتی ہیں شکیلؔ
مَیں رات بھر انھیں آنکھوں میں بند رہتا ہوں

صبح کی دھوپ! یہ معصوم فضا رہنے دے
اور کچھ دیر لبِ گل پہ دعا رہنے دے

ایسے موسم میں کوئی پھول کہاں کھلتا ہے
مَیں اگر کھِل بھی گیا ہوں، تو کھِلا رہنے دے

فصلِ نو! ہم تجھے پرکھیں گے، مگر شرط یہ ہے
پچھلے موسم کا بھی اک زخم ہرا رہنے دے

بند کمرے کے دریچے کا تقاضا بھی سمجھ
سانس لینے کے لیے کچھ تو ہوا رہنے دے

آج آنکھوں میں کوئی رات گئے آئے گا
آج کی رات یہ دروازہ کھلا رہنے دے

رات کا وقت ہے اور راہ بھی سونی ہے شکیل
دل کی دہلیز پہ اک دیپ جلا رہنے دے

اے لمحۂ وصال! کبھی آ کے رُت بدل
آنکھوں سے انتظار کی زنجیر چھین لے

ہوا نہ ختم عذابوں کا سلسلہ اب تک
خزاں کی زد میں بھی اک پھول ہے ہرا اب تک

ملا تھا زہر جو ورثے میں، پی رہے ہیں ہم
نہ اس نے صلح کی سوچی، نہ میں جھکا اب تک

یہ سچ ہے، وہم کے دلدل سے لوٹ آیا ہوں
مگر یقین کا دُھندلا ہے آئینہ اب تک

اِنھی غموں کا وہ اک دن حساب مانگے گا
فلک سے جو مرے کشکول میں پڑا اب تک

ابھی ابھی مری آنکھوں نے کھو دیا اُس کو
وہ درد بن کے مری سسکیوں میں تھا اب تک

نہ جانے کتنی بَلی دی ہے رت جگوں کی اُسے
مگر ملا نہ وہ خوابوں کا دیوتا اب تک

جُدا ہوئی تھی جہاں مِل کے زندگی اک دن
بھٹک رہی ہے وہیں میری آتما اب تک

یہ اونچے نیچے پہاڑوں پہ راستے کا وجود
ترے بدن کا نشیب و فراز ہو جیسے

نا امیدی میں امیدوں کا سفر جاری ہے
پھول کی چاہ میں کانٹوں کا سفر جاری ہے

اب بھی کچھ خواب بھٹکتے ہیں کھلی سڑکوں پر
اب بھی ٹوٹے ہوئے رشتوں کا سفر جاری ہے

اب بھی اک ہاتھ ہواؤں میں ہلا کرتا ہے
اب بھی بے شکل صداؤں کا سفر جاری ہے

اب بھی اُڑتا ہے خیالوں میں دھواں ماضی کا
اب بھی بے نام عذابوں کا سفر جاری ہے

اب بھی دیوار کے اس پار سے آتی ہے صدا
اب بھی ویرانے میں روحوں کا سفر جاری ہے

اب بھی اک ٹوٹے ہوئے خواب سے رشتہ ہے مرا
اب بھی بھیگی ہوئی راتوں کا سفر جاری ہے

گیت گاتی ہے مرے گاؤں میں ساون کی پھوار
نیم کے پیڑ پہ جھولوں کا سفر جاری ہے

قربتوں کے درمیاں ہی فاصلے پلتے رہے
دو قدم منزل تھی لیکن عمر بھر چلتے رہے

لہو میں ڈوبا ہوا چاند بے لحاف بھی ہو
بدن میں رینگتے سائے کا انکشاف بھی ہو

یہ بند آنکھوں میں سپنے کہاں سے آتے ہیں
ردائے نیند میں شاید کوئی شگاف بھی ہو

کبھی کبھار کوئی رُت ہو بھیگنے والی
کبھی کبھار یہ چہرے کی گرد صاف بھی ہو

ملا ہے زخم، تو اس زخم کے بھرم کے لیے
مرے لبوں پہ تبسم کا اک غلاف بھی ہو

میں اپنے آپ میں بیدار رہنا چاہتا ہوں
کبھی کبھی کوئی سازش مرے خلاف بھی ہو

مرے رفیق! تکلف کے دائرے سے نکل
کہ اتفاق میں تھوڑا سا اختلاف بھی ہو

یہ کیا، کہ میری ہر اک بات مستند ہو جائے
مزہ تو جب ہے، کہ لوگوں کو انحراف بھی ہو

مرے ہنر کو کوئی معجزہ سمجھتا ہے
تمام شہر مجھے دیوتا سمجھتا ہے

شکیلؔ[1] شاہ کے مانند چاہتا ہے بہت
نمؔ اعظمی[2] بھی مجھے آئینہ سمجھتا ہے

یہ خود فریبی اسے ایک دن ڈبو دے گی
وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے

وہ شخص یوں تو حقیقت میں ہے وہی لیکن
مرا گمان اسے دوسرا سمجھتا ہے

اکیلے پن کی اذیت کا کوئی نام نہیں
یہ کرب وہ ہے جسے راستہ سمجھتا ہے

---

[1] شکیل شاہ ، [2] نم اعظمی ۔ میرے یار جانی

مَیں جسکی کھوج میں صدیوں سے گھر نہیں آیا
مرا وجود اسی کو نظر نہیں آیا

وہ بار بار اسی راستے سے گزرا ہے
یہ اور بات کبھی میرے گھر نہیں آیا

مَیں جسکی چھاؤں میں کچھ دیر رک کے سستاؤں
رہِ حیات میں ایسا شجر نہیں آیا

یہ اتفاق ہے، جس نے ملا دیا ورنہ
مَیں اس طرف تری آواز پر نہیں آیا

یہ کیسی راہِ وفا، جس میں نہ الزام، نہ سنگ
کوئی عذاب ابھی میرے سر نہیں آیا

دوا کی شکل ابھی درد سے نہیں ملتی
ابھی شباب پہ زخمِ جگر نہیں آیا

یہ کیسی رات ہے یارب! کہ ایک مدت سے
نظر کے سامنے وقتِ سحر نہیں آیا

تمام رات ستارے بجھے بجھے سے رہے
مگر گھٹا سے نکل کر قمر نہیں آیا

شکیلؔ! دیکھ تو جا کے، کیوں اس کی جانب سے
بہت دنوں سے کوئی نامہ بر نہیں آیا

کسی بھی کھیت پہ برسے کہیں کا ہو جائے
خدا کرے، کہ یہ بادل زمیں کا ہو جائے

دعا کرو، وہ ستارہ زمین پہ ٹوٹ گرے
ہمارے ساتھ رہے، اور یہیں کا ہو جائے

عجب نہیں، کہ جہاں ہم گماں سے نکلیں
وہیں پہ قتل دوبارہ یقیں کا ہو جائے

یہ چاہتا ہوں، کہ اب کے فلک کا کوئی عذاب
مکاں کے نام نہ اترے، مکیں کا ہو جائے

مَیں اس کے جسم کا سب زہر پی کے مر جاؤں
اگر وہ سانپ مری آستیں کا ہو جائے

مرے شکیلؔ کو پریوں کے دیس مت بھیجو
عجب نہیں، کہ یہ پاگل وہیں کا ہو جائے

کر دیا آزاد اک طوطے کو پنجرے سے شکیلؔ
جب مجھے پردیس میں اپنا وطن یاد آ گیا

چراغ ہوتے ہوئے تیرگی قبول کی ہے
تمام عمر کی تعزیر ایک بھول کی ہے

خیال آیا ہے، اب راستہ بدل لیں گے
ابھی تلک تو بہت زندگی فضول کی ہے

خدا کرے، کہ یہ پودا زمیں کا ہو جائے
کہ آرزو مرے آنگن کو ایک پھول کی ہے

نہ جانے کون سا لمحہ مرے قرار کا ہے
نہ جانے کون سی ساعت ترے حصول کی ہے

نہ جانے کون سا چہرہ مری بیاض کا ہے
نہ جانے کون سی صورت ترے نزول کی ہے

جنھیں خیال ہو آنکھوں کا لَوٹ جائیں وہ
اب اس کے بعد حکومت سفر میں دھول کی ہے

یہ شہرتیں ہمیں یونہی نہیں ملی ہیں شکیلؔ
غزل نے ہم سے بھی قیمت بہت وصول کی ہے

مجھ کو چننے کے لیے آیا تھا اِس پار کوئی
مَیں کہ دیوار کے اُس پار تھا ٹکڑے ٹکڑے

مرے حریف نے میدانِ جنگ چھوڑ دیا
ذرا سی چوٹ پہ لوہے نے زنگ چھوڑ دیا

گزشتہ سال کی گرمی عذاب جیسی تھی
وہ لو چلی، کہ مکانوں نے رنگ چھوڑ دیا

تمام جسم پہ نیلی سی موج دوڑ گئی
کسی نے جھیل سی آنکھوں میں سنگ چھوڑ دیا

فلک نے مل کے خلاؤں سے سازشیں کرلیں
پھر اس کے بعد زمینوں کا سنگ چھوڑ دیا

کچھ اس طرح سے مسائل نے آلیا ہم کو
تجھے غزل میں سمونے کا ڈھنگ چھوڑ دیا

رنگ سب دھندلے تھے، لیکن تیرگی اتنی نہ تھی
زندگی پہلے بھی ٹوٹی تھی، مگر بکھری نہ تھی

کچھ تو یوں بھی تھا صحت سے فاصلہ رکھتے تھے ہم
اور کچھ اس شہر کی آب و ہوا اچھی نہ تھی

آئینے کے پاس جو چہرہ تھا، وہ میرا ہی تھا
آئینے میں شکل جو ابھری تھی وہ میری نہ تھی

اس طرح رکھتے تھے ہم دونوں تعلق کا بھرم
ٹوٹ بھی جاتے تھے اور آواز بھی ہوتی نہ تھی

جانے وہ کیسی گھڑی تھی اس سے جب بچھڑے شکیلؔ
دل بھی افسردہ نہ تھا، اور آنکھ بھی روتی نہ تھی

ذہن میں بیتے ہوئے لمحوں کا خمیازہ نہ تھا
ڈوبنے سے قبل گہرائی کا اندازہ نہ تھا

چور گھس آئے، تو ننگی چوکھٹوں کے دن پھرے
اس سے پہلے میرے گھر میں کوئی دروازہ نہ تھا

لمحہ لمحہ، زندگی نے خرچ کر ڈالا ہمیں
وقت جب آیا بکھرنے کا تو شیرازہ نہ تھا

ڈھونڈ کر مرہم کبھی ہم لائے، تو ایسے وقت میں
زخم سارے بھر چکے تھے، ایک بھی تازہ نہ تھا

شکر کر میرے جنوں کا، ورنہ اے عہدِ غزل
خونِ دل میرا ترے رخسار کا غازہ نہ تھا

مَیں بکھر جاؤں، سمیٹیں مجھے اس کی آنکھیں
اپنی پلکوں پہ سجالیں مجھے اس کی آنکھیں

روٹھ جاؤں تو اشارے سے منالیں مجھ کو
اور کھو جاؤں تو ڈھونڈیں مجھے اس کی آنکھیں

گھر کی دہلیز سے لگ کر مرا رستہ دیکھیں
دیر سے آؤں تو بولیں مجھے اس کی آنکھیں

رات بھر میرے تعاقب میں پھریں گلیوں میں
صبح ہو جائے تو روئیں مجھے اس کی آنکھیں

گھر میں مل جائیں تو چھپ جائیں مری آنکھوں سے
راہ میں پائیں تو چھیڑیں مجھے اس کی آنکھیں

مَیں، کہ آکاش پہ جلتا ہوا تارا، کوئی
رات بھر جاگ کے دیکھیں مجھے اس کی آنکھیں

مَیں جو چھپ جاؤں کبھی رات کی تاریکی میں
اپنی پلکوں سے ٹٹولیں مجھے اس کی آنکھیں

ختم ہو جائے یہ ہونٹوں کے جزیروں کا سفر
پیاس بجھ جائے ڈبو دیں مجھے اس کی آنکھیں

اب یہاں کوئی نہیں رہتا، مگر پھر بھی شکیلؔ
جیسے کھڑکی سے پکاریں مجھے اس کی آنکھیں

دیکھتا ہے وہ کھڑکیوں سے مجھے
پار کرتا ہے کشتیوں سے مجھے

ریل سے پہلے کٹتے دیکھے گا
پھر سمیٹے گا پٹریوں سے مجھے

ریت کو بھی پتہ نہیں چلتا
کون لکھتا ہے انگلیوں سے مجھے

بھیگے کاغذ پہ کچھ لکیریں تھیں
یاد آیا ہتھیلیوں سے مجھے

پھر میں ڈھونڈوں اُسے زمانے تک
پھر پکارے وہ دوریوں سے مجھے

اور کچھ دن اگر کھِلا رہتا
پیار ہو جاتا تتلیوں سے مجھے

ٹھیک سے بات کر نہیں پاتا
شرم آتی ہے لڑکیوں سے مجھے

جب کوئی یاد کرنے والا نہیں
کیا علاقہ ہو ہچکیوں سے مجھے

میری جانب بھی کوئی ہاتھ بڑھے
کھینچ لے کوئی کھائیوں سے مجھے

دل میں یادوں کا سلسلہ ہے ابھی
ایک سایہ سا رینگتا ہے ابھی

کوئی مجھ کو لہو کے دریا سے
گاہے گاہے پکارتا ہے ابھی

مَیں بھی ماضی کی دسترس میں ہوں
وہ بھی اندر سے ٹوٹتا ہے ابھی

اس کا سایہ مرے فرشتوں سے
میرے بارے میں پوچھتا ہے ابھی

اس کا غم میری عافیت کے لیے
دل کی دہلیز پر کھڑا ہے ابھی

وہ مجھے پا کے مطمئن ہے، مگر
حادثہ مجھ کو ڈھونڈتا ہے ابھی

اس کی آنکھیں بتا رہی ہیں شکیلؔ
وہ مرے خواب دیکھتا ہے ابھی

ایسی ویسی کتاب پڑھتے ہو
کبھی دیوان میر دیکھے ہو

ایک ہفتے کے بعد آئے ہو
اور یہ پوچھتے ہو، کیسے ہو

میرے شعروں کی داد دیتے ہو
تم بھی اندر سے ٹوٹے لگتے ہو

میری آنکھوں میں کیوں چمکتے ہو
تم کسی اور کے ستارے ہو

ٹوٹ جاؤ گے تم بھی میری طرح
تم بھی میری طرح ستارے ہو

شہر کے لوگ تم پہ ہنستے ہیں
گاؤں والوں کی طرح بھولے ہو

مجھ سے ملنے کبھی نہیں آتے
اور مرا راستہ بھی تکتے ہو

در و دیوار پوچھتے بھی نہیں
رات بھر کس سے بات کرتے ہو

پیار کرنے سے روکتے ہو ہمیں
اتنا سنگین جرم کرتے ہو

ان دنوں تم شکیلؔ غزلوں میں
یار لوگوں کو اچھے لگتے ہو

بچ نکلنے کی راہ کوئی نہیں
اب کے جائے پناہ کوئی نہیں

ہم بھی کاسہ بدست ہیں اب کے
اور عالم پناہ کوئی نہیں

اس کی آنکھیں ہیں ڈوبنے کیلئے
اس سمندر کی تھاہ کوئی نہیں

ہم نے پوری بیاض لکھ ڈالی
اور کاغذ سیاہ کوئی نہیں

اک تو ہی اعظمی سا لگتا ہے
اور سورت میں شاہ کوئی نہیں

شاہ — شکیل شاہ

برہنہ سر ہوں، اک دستار دے دے
مرے مولا مجھے گھر بار دے دے

فلک کو چوم لینا چاہتا ہوں
مری بنیاد کو دیوار دے دے

غزل کی آبرو رکھنی ہے مجھ کو
مرے افکار کو معیار دے دے

مَیں تجھ سے بات کرنا چاہتا ہوں
زباں کو جرأتِ اظہار دے دے

ہوس کے ہاتھ بڑھتے جا رہے ہیں
گلوں کی ٹہنیوں کو خار دے دے

رنگ غزل کا ایسا ہو
جیسے کوئی سپنا ہو

شہر میں کوئی ایسا ہو
ہم سے ملتا جلتا ہو

کس سے دل کا حال کہیں
گھر میں کوئی اپنا ہو

میرے نام کی تختی پر
اس کا نام بھی لکھا ہو

آنکھیں اس کی آنکھیں ہوں
چہرہ اس کا چہرہ ہو

اِس جنگل سے اُس بستی کے
بیچ میں کوئی رستہ ہو

کھڑکی کھول کے دیکھو تو
شاید جگنو آیا ہو

ایسا بھی اک موسم آئے
قطرہ قطرہ دریا ہو

دھڑکنوں میں کسی دستک کی صدا ہو جیسے
دل کا دروازہ کوئی کھول رہا ہو جیسے

جانے کس موڑ پہ یہ وہم حقیقت بن جائے
میرے پیچھے کوئی سایہ سا لگا ہو جیسے

لمس، احساس کو کچھ ایسے ہوا دیتا ہے
وہ مجھے اپنا بدن سونپ گیا ہو جیسے

فکر میری کسی مزدور کے گھر کی چوکھٹ
جسم میرا کہیں رستے میں پڑا ہو جیسے

ایسا لگتا ہے کھلے پھول پہ شبنم کا وجود
اس کے ہونٹوں پہ مرے حق میں دعا ہو جیسے

یوں مچلتی ہیں سماعت پہ ہوا کی لہریں
اس نے چپکے سے مرا نام لیا ہو جیسے

یوں سمایا ہے ہواؤں میں بدن خوشبو کا
روح میں غم کوئی تحلیل ہوا ہو جیسے

دیکھ لیتا ہے مجھے وہ بھی کن انکھیوں سے شکیل
میرے من میں بھی کوئی چور چھپا ہو جیسے

آخری داغ بھی چادر کے حوالے کر دو
یہ بھی الزام مرے سر کے حوالے کر دو

مجھ سے ہی رسمِ کہن ٹوٹے ۔ وفا کی خاطر
لو مرا سر کسی پتھر کے حوالے کر دو

چھین لو مجھ سے روانی، کہ میں بہتا ہوں بہت
میری پہچان سمندر کے حوالے کر دو

منزلِ جاں سے بڑھے ہم، تو زمیں چیخ اٹھی
جسم تھک جائے تو بستر کے حوالے کر دو

اس سے پہلے، کہ مجھے دھوپ کا اندازہ ہو
میری دستار مرے سر کے حوالے کر دو

تری زمیں میں محبت کے بیج بو نہ سکوں
تو مل بھی جائے تو شاید میں تیرا ہو نہ سکوں

غمِ حیات! تو چپکے سے خودکشی کر لے
میں اپنے ہاتھوں سے شاید تجھے ڈبو نہ سکوں

تمام اشک کسی اور کی امانت ہیں
اگر میں رونا بھی چاہوں تو کھُل کے رو نہ سکوں

یہ بیوفائی تو پہلے سے میرے دھیان میں تھی
وہ داغ دے، کہ جسے عمر بھر میں دھو نہ سکوں

تمام دن تجھے ڈھونڈوں، ترا پتہ نہ چلے
تمام رات اسی رنج میں مَیں سو نہ سکوں

تو اپنا غم بھی مجھے دے، کہ رات ڈھل جائے
مَیں اپنی آنکھوں سے ممکن ہے اتنا رو نہ سکوں

شکیلؔ اس کو کسی نظم میں لکھوں گا کبھی
غزل کی آنکھ میں شاید اسے پرو نہ سکوں

اسی زمین کی آواز آسمان میں تھی
ہماری آہ کبھی اس کی داستان میں تھی

ہم اپنے گھر میں مقیّد تھے اپنے جسم کے ساتھ
ہماری روح کسی اور کے مکان میں تھی

اب اس کی راکھ بھی اُڑتی نہیں خیالوں میں
وہ آرزو، جو محبت کے سائبان میں تھی

خدا کرے، کہ نئی نسل اس سے دور رہے
وہ دشمنی، جو ترے میرے خاندان میں تھی

تمہاری موت نے مارا ہے جیتے جی ھم کو
ہماری جان بھی گویا تمہاری جان میں تھی

ذرا سا اور تھا ٹیلوں کے راستوں کا سفر
پھر اسکے بعد ہر اک رہگذر ڈھلان میں تھی

تمام جسم ہی ڈوبا ہوا تھا مستی میں
سفر کے بعد عجب کیفیت تھکان میں تھی

اُسے شعور کی تلخی میں ڈھونڈتا ہوں شکیلؔ
وہ چاشنی جو مری توتلی زبان میں تھی

سوچتا ہوں، غمِ دنیا کا مداوا کر لوں
آج کی شب تری آنکھوں میں بسیرا کر لوں

تجھ سے اک بار ملوں، مل کے جدا ہو جاؤں
اور پھر خود کو ترے غم میں اکیلا کر لوں

روز جب جگنو کے چمکنے کا تماشہ دیکھوں
کھڑکیاں کھول دوں، کمرے میں اندھیرا کر لوں

بھول جاؤں، کہ خراشوں سے کوئی رشتہ تھا
آئینہ توڑ دوں، چہرے پہ بھروسہ کر لوں

ورنہ دیوان چھپانے کی ضرورت کیا تھی
جی میں آیا ہے، کہ جذبات کا سودا کر لوں

مجھ پہ ہیں سیکڑوں الزام مرے ساتھ نہ چل
تو بھی ہو جائے گا بدنام مرے ساتھ نہ چل

تو نئی صبح کے سورج کی ہے اُجلی سی کرن
میں ہوں اک دھول بھری شام مرے ساتھ نہ چل

اپنی خوشیاں مرے آلام سے منسوب نہ کر
مجھ سے مت مانگ مرا نام مرے ساتھ نہ چل

تو بھی کھو جائے گی ٹپکے ہوئے آنسو کی طرح
دیکھ لے گردشِ ایام! مرے ساتھ نہ چل

میری دیوار کو تو کتنا سنبھالے گا شکیلؔ
ٹوٹتا رہتا ہوں ہر گام مرے ساتھ نہ چل

شکیل اعظمی کی غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ

(زیر ترتیب)

اک نیا شعر کہنے والا ہوں
اک نیا گیان ہونے والا ہے

○ طباعت :

✆ 430945 Mulla Bada Road, Malegoan-423203

شکیل اعظمی کی شاعری میں وہ فطری اٹھان، شگفتگی اور تازگی ہے، جو خداداد تخلیقی صلاحیت کا ثبوت ہے۔

پروفیسر وارث علوی

اردو شاعری کے افق پر شاعری کے کئی رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے نمودار ہوئے، مگر جس رنگ کی پذیرائی ہوئی وہ شاعری کا سچا اور کھرا رنگ ہے جس کی اساس کلاسیکی جمالیات پر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ شکیل اعظمی نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران اس نکتے کی معنویت کو نہ صرف یہ کہ پوری طرح سمجھا ہے بلکہ اس کو فنکارانہ سطح پر جینے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کی شاعری میں نئی زندگی کی عکاسی ہی نہیں بلکہ اس سے آنکھیں ملانے کا احساس بھی کارفرما ہے۔ انھوں نے اپنے تخلیقی شعور کو رہنما بنا کر اپنا فنکارانہ سفر طے کیا ہے اور اس راہ کے اکثر تجربوں کو لفظ و معنی کا وہ پیکر عطا کیا ہے جس کی اساس کلاسیکی جمالیات پر ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی

اردو ادب اور سماج دن بہ دن محدود ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود کچھ سر پھرے نوجوان جب اس قافلے میں شامل ہوتے ہیں تو استعجاب انگیز خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ شکیل اعظمی بھی ایسے ہی سر پھرے اور نوجوان شاعروں میں شامل ہیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ یہ نوجوان اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی جانتا ہے۔ اتنی کم عمر میں لفظوں کے در و بست اور ان کے استعمال کا ہنر شکیل اعظمی کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ "دھوپ دریا" شکیل اعظمی کا پہلا شعری مجموعہ ہونے کے باوجود قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ادبی حلقوں میں یقیناً اس کی پذیرائی ہوگی۔

"جواز پبلیکیشنز" نے ہمیشہ ادبی و معیاری کتابیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ مجموعہ بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگا۔

سید عارف

جواز پبلیکیشنز "المامون" نعمانی چوک، جامعہ روڈ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (بھارت)